خیرباد اِلحاد



نعمان نیئر کلاچوی

خیر بادِ الحاد

نعمان نیئر کلاچوی

نام مقالہ خیر بادِ الحاد

مصنف نعمان نیرؔ کلاچوی

ناشر مرشد پبلی کیشنز، کلاچی، ڈیرہ اسماعیل خان

پی ڈی ایف ایڈیشن مئی، 2025

☆☆☆☆☆

فہرست عنوانات

پیش گفتار

اِلحاد آجکل ایک فیشن بن چکا ہے اور اب تو ہمارے ہاں کے نوجوان بڑے فخر سے کہنے لگے ہیں کہ اَجی ہم تو کسی مذہب پر یقین نہیں رکھتے اور پھر جواب میں اِس کارنامہ پر داد کی اُمید بھی لئے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اصل میں جب تک ایک مسلمان روایتی مسلمان سے شعوری مسلمان یعنی مؤمن نہیں بن جاتا تب تک نہ تو ہماری نئی نسل اِس فساد سے محفوظ رہ سکتی ہے اور نہ ہی ہم خود۔

باقی بحث تو آئندہ کے ابواب میں آ ہی جائے گی یہاں پر صرف ایک سوال ملحدین نوجوانوں سے پوچھنے کی جسارت کروں گا کہ مذہب ترک کرنے کے بعد وہ کونسی علم و حکمت اور وہ کونسا نادر فہم ہے جو آپ کے ہاتھ لگ جاتا ہے ؟۔

یہی شوشہ تو پندرھویں صدی عیسوی کے ذہین فلاسفہ نے بھی چھوڑا تھا کہ بائبل اور چرچ کو ترک کرکے ہم روشن خیالی (Enlightenment) کی بنیاد رکھ رہے ہیں اور پھر آج ہم اپنی ذات کا جائزہ لیکر آسانی کے ساتھ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ خدا اور وحی کو ترک کرنے کے بعد انسان اب تک خدا اور وحی کا مصنوعی متبادل پیدا کرنے کی کوشش ہی کر رہا ہے مگر کامیاب نہیں ہو پا رہا۔ نامور فلاسفہ تو خدا اور وحی پر تنقید کرکے اپنی روزی روٹی کماتے رہے، کوئی

اِکاّ دُکاّ کانٹ جیسے لٹھ لیکر عقل کے پیچھے پڑے تو چیخ اُٹھے کہ عقل حقائق دریافت کر سکتی ہے پیدا نہیں کر سکتی اور پھر انسان کو اخلاقی طور پر نتھ ڈالنے کیلئے وحی کا ایک مضحکہ خیز متبادل اُمرِ مطلق یعنی Categorical Imperative ایجاد کر کے سائیڈ پر ہو لئے۔ اب بندہ پوچھے کہ یہ اَمرِ مطلق کیا بَلا ہے؟، بڑے میاں جب آپ کسی قدر کو مطلق ہی نہیں مانتے تو پھر اپنی طرف سے ایک اضافی قدر کو مطلق کیسے بنا رہے ہیں؟۔ بس یہی منطقی تضادات ابتداء ہی سے تمام فلاسفہ کا کُل حاصل وصول ہیں۔

ملحدین کا عجیب شغل ہے کہ انبیاء کی تعلیمات کو قصّے کہانیاں کہتے ہیں جبکہ ڈیکارٹ اور ہیوم کی گپ شپ کو علم کہتے ہیں۔ ڈیکارٹ کہتے ہیں کہ "مَیں سوچتا ہوں اِس لئے مَیں ہوں"۔ سبحان اللہ۔ یہ کوئی نئی بات ہے جو آپ بتا رہے ہیں۔ انسان ہزاروں سالوں سے یہ جانتا کہ وہ غور و فکر کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ مَیں سوچتا کیوں ہوں؟، اور اِس کیوں کا جواب تو قیامت تک یہ اپنی عقل سے نہیں جان سکتے۔

اصل میں بات بہت ہی سادہ اور صاف ہے۔ خدا اور وحی نہ صرف انسان بلکہ اِس پوری کائنات کی تشفی بخش توجیہ پیش کر دیتے ہیں اور یوں انسان سکھ کا سانس لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اب جب آپ انبیاء کی تعلیمات کو کہانی سمجھ کر آگے

بڑھتے ہیں تو آگے آپ حیرت و استعجاب کے ایک نہ ختم ہونے والے لق و دق صحراء میں یک تنہاء کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب کریں مداوا اپنی اِس بے بسی کا، آخر میں ہونا تو پھر یہی ہے نا کہ البر اکامیو کی نصیحت کے مطابق خودکشی کر کے ہی اِس عذاب سے جان چھڑائی جا سکتی ہے۔ بس یہیں سے انسان اگر اپنے شعور کو بروئے کار کر تھوڑی سی ہمت کر کے ہدایت کا سچا طالب بن جائے تو آگے رستہ ایک دَم صاف ہو جاتا ہے۔ وحی بھی تو یہی بنیادی نکتہ بیان کر رہی ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَاؕ-وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ اور وہ لوگ جو جہد کریں گے ہمارے راستے میں، تو اُن کیلئے ہم ہدایت کا رستہ صاف کر دیں گے،اور اللّٰہ تو محسنین کے ساتھ ہے۔ (العنکبوت۔69)۔

دیکھیں علم و حکمت تلاش کرنے والوں کو اللّٰہ محسن کہہ رہا ہے یعنی وحی کے مطابق علم و ہدایت کی تلاش فی نفسہ ایک نیک عمل ہے۔ یہ دراصل تکریم ہے اُن باشعور نفوس کیلئے جو سچائی کیلئے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

اب اگر یہ کہانی ہے تو پھر انسان بتائے کہ اُسے اخلاقی شعور کہاں سے ملا یا کم از کم اتنا ہی بتا دے کہ انسان کے اندر اخلاقی شعور پیدا ہی کیسے ہوا جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ پوری کائنات یعنی اَرض و سماء میں کہیں کوئی ایسی مخلوق موجود نہیں جو اخلاقی شعور

کی حامل ہو تو آخر یہ نادر صلاحیت انسان میں کیسے در آئی؟۔ سچ پوچھیں تو ہدایت کی کھوج کیلئے یہی ایک سوال ہی کافی و شافی ہے۔

بالفرض مان لیا جائے کہ انسان ایک ارتقاء یافتہ جانور ہے تو تب بھی سوال وہی پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسی صلاحیت جو سرے سے انسان کے ماقبل جانور میں موجود ہی نہیں تھی تو انسان کے اندر کیسے واقع ہو گئی؟۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ کیا اب یہیں سے اندازے اور گپ شپ نہیں شروع ہو جاتی کہ جی انسان جب معاشرت میں رہنے لگا تو اُس کے اندر سچائی، ہمدردی اور رحم پیدا ہوا، یا پھر یہ انسان جب ارتقاء پذیر ہوا تو اُس کے دماغ میں کچھ ایسے کیمیکل پیدا ہونا شروع ہوئے جنہوں نے انسان کے اندر سچائی کی طلب، ہمدردی اور رحم جیسے رویے پیدا کرنا شروع کر دیئے وغیرہ وغیرہ،،، ٹامک ٹوئیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جسے فارغ المذہب بیان کرنے لگتے ہیں اور باشعور انسانوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اِن پر یقین کریں۔

اگر شعوری دیانت سے کام لیا جائے تو معاملہ بالکل سیدھا ہو جاتا ہے کہ معاشرت نے اخلاقیات نہیں پیدا کیں بلکہ اخلاقیات نے معاشرت کو جنم دیا۔ حُسن کی طلب نہ تو انسانی دماغ کی کسی کیمیائی سرگرمی کے سبب وقوع پذیر ہوئی اور نہ ہی یہ جنگلی جانوروں کے ساتھ رہنے کے سبب واقع ہوئی،یہ تو عطیہِ خداوندی ہے جو کئی

انواع کے جانوروں میں سے صرف انسان کے حصے میں اُس کے خالق کے ارادے سے ممکن ہوا۔ یہی خبر ہمیں وحی سے ملتی ہے۔ القرآن-ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ وَجَعَلَ لَـكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـئِدَةَ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ۔ پھر انسان کو جسمانی طور پر معتدل (Fine-tuned) کیا اور اُس میں اپنی روح پھونک دی اور تمہارے لئے سماعت، بصارت اور بصیرت کا انتظام کیا، کم ہی تم میں سے شکر گزار ہیں۔ (سورہ السجدہ-32)

اب اگر یہ کوئی افسانہ ہے تو پھر اِس سے معقول اور تشفی بخش توجیہ پیش کی جائے کہ انسان کے اندر اخلاقی شعور کیسے پیدا ہوا؟۔ انسان بالیقین ایک مخلوق ہے۔ یہ نہیں ہوتا، پھر ہو جاتا ہے۔ پھر نہیں ہوتا اور پھر ایک دن ہو جاتا ہے یا کم از کم ہو سکتا ہے تو ایسی صورت میں یہ نکتہ تو واضح ہو گیا کہ انسان قادر مطلق نہیں ہے۔ پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ انسان قادر مطلق نہیں ہے تو پھر یہ مخلوق ہو کر اپنے نفس کی توجیہ کیسے پیش کر سکتا ہے ؟۔ معاملہ ایک دم سیدھا سادہ ہے بشرطیکہ انسان شعوری دیانت سے کام لے۔

فقیر

نعمان نیرّ کلاچوی

20 مئی، 2025

اخلاقی شعور کی ملحدانہ تصریح

اِس وقت قریباً پوری دنیا جس عذابِ الیم میں گرفتار ہو چکی ہے انفرادی سطح پر اُسے لامقصدیت (Absurdism) اور سماجی سطح پر لااخلاقیت (Amoralism) کہتے ہیں۔ یعنی زندگی کا کوئی متعین مقصد نہیں ہے پس جیسے چاہو ضرورت کے مطابق اپنا مقصد گھڑ کر جینا شروع کردو۔ زندگی میں کوئی مستقل اخلاقی اقدار موجود نہیں ہیں پس سچ اور جھوٹ، صحیح اور غلط سب وقت اور سماج کی ضرورت کے مطابق بدلتے رہیں گے۔

نتیجہ کیا نکلا کہ انسان اندر سے بالکل خالی ہو کر ایک لق و دق صحراء میں حیران و پریشان کھڑا رہ گیا۔ مَیں نے اخلاقی اضافیت (Moral Relativism) کی جگہ لااخلاقیت کی اصطلاح اِس لئے استعمال کی ہے کہ اخلاقیات جیسے ہی ایجادِ بندہ (Man-made) بنیں تو یہ دھڑام سے گر گئیں۔ مثلاً سچائی وہ ہے جسے مَیں اور میرا مخاطب دونوں ایجاد و توضیع سے ماوراء ہو کر تسلیم کرلیں ورنہ جب معاملہ ایسا ہو جائے کہ سچ ہم دونوں کے باہمی معاہدہ سے طے پائے تو پھر وہ سچ نہیں بلکہ ہم دونوں کے درمیان ایجاد کردہ ایک وقتی ضرورت بن جاتا ہے۔ اِسی طرح ہم دونوں میں سے جب کسی ایک کی ضرورت پوری ہوئی تو یہ معاہدہ خود ہی غیر مؤثر

ہو جائے گا اور وہ سچ جو ہم دونوں نے گھڑا تھا، مزید سچ نہیں رہے گا۔ اب آپ خود غور کریں کہ اخلاقی اضافیت اپنی اصل میں لااخلاقیت نہیں تو اور کیا ہے۔

اِس وقت سارا زور جس انسانی صلاحیت پر ہے اُسے عقلیت (Rationality) کہتے ہیں یعنی ہم انسان صرف اور صرف اپنی عقلیت کی بنیاد پر فیصلہ کریں گے کہ ہم کون ہیں؟، کیوں ہیں؟، ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟۔ چلیں پھر عقل سے پوچھ لیتے ہیں کہ ہم کون ہیں؟۔ کریں غور اگر کچھ دریافت ہو جائے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ عقل تو علم پیدا ہی نہیں کرتی۔ عقل علم دریافت کرتی ہے، تجزیہ کرتی ہے، ادراک حاصل کرتی ہے، ادراک کو منظم کرتی ہے یا دستیاب مدرکات کی بنیاد پر کوئی نیا تخیل دریافت کر لیتی ہے۔ بس اِس کے علاوہ تو عقل کا کوئی کام ہی نہیں ہے۔ یعنی عقل کوئی نیا علم نہیں پیدا کر سکتی بالکل یہی حال تجربہ کا بھی ہے کہ وہ بھی نیا علم پیدا نہیں کرتا بلکہ دستیاب وسائل پر غور و فکر کر کے کچھ نئے تصورات گھڑ لیتا ہے یا حسیات کی بنیاد پر کچھ نئی کیفیات دریافت کر لیتا ہے۔

اصطلاح میں اِسی محنت کو سائنس کہتے ہیں۔ طبیعی سائنس درحقیقت مادہ کی کیفیت دریافت کرنے کا نام ہے اور بس یہی اِس کی حد ہے۔ مَیں کون ہوں کا جواب سائنس نہ دے سکتی ہے اور نہ ہی اِس کے ذمہ ہے، یہ تو بیچارے فارغ المذہب

ایویں خواہ مخواہ سائنس کو زحمت دینے لگتے ہیں کہ وہ ایسے سوالات کا جواب دے جس کی وہ مکلّف ہی نہیں ہے۔

یاد رکھنے کا نکتہ یہ ہے کہ عقل اور تجربہ مطلق اقدار نہیں پیدا کر سکتے یعنی عدل کی طلب عقل یا تجربہ کی پیداوار نہیں بلکہ انسان کے خمیر میں موجود اخلاقی شعور کا ایک عملی اظہار ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کے اندر اخلاقی شعور پیدا کیسے ہوا؟، اگر تو انسان کو ایک اِرتقاء یافتہ جانور مان لیا جائے جیسے کہ جدید ذہن کا اصرار ہے۔ آئیے پہلے اخلاقی شعور کی موجودگی کی ملحدانہ تصریح کرتے ہیں۔

اخلاقی شعور کے بارے میں مختلف ملحدانہ نظریات درج ذیل بنیادوں پر قائم ہیں۔

1.ارتقائی نظریہ(Evolution Theory)

یہ نظریہ کہتا ہے کہ اخلاقی شعور انسان میں فطری ارتقاء(Evolution) کے عمل سے پیدا ہوا۔ قدیم انسانوں نے جب گروہوں میں رہنا شروع کیا تو تعاون، ہمدردی اور انصاف جیسے رویے اِن کی بقاء کیلئے مفید ثابت ہوئے چنانچہ جو افراد یا گروہ زیادہ "اخلاقی" تھے، وہ بہتر طریقے سے زندہ رہے اور اُنہی کے جینز آگے بڑھے۔ اِسی طرح اخلاقیات کا بیج قدرتی انتخاب(Natural Selection) کے ذریعے پختہ ہوا۔

2.سماجی معاہدہ(Social Contract)

بعض ملحد فلسفیوں کا کہنا ہے اخلاقیات انسانوں کے باہمی معاہدے کا نتیجہ ہیں تاکہ معاشرہ منظم رہے۔ یہ ایک قسم کا "معاہدہ" ہے کہ اگر میں تمہیں نقصان نہیں دوں گا تو تم بھی مجھے نقصان نہیں دو گے۔اِس سے امن، تعاون اور معاشرتی بھلائی ممکن ہوئی۔

3. عصبیاتی اور نفسیاتی بنیادیں

(Neuroscience & Psychology)

سائنس دانوں نے مختلف تجربات سے اندازہ لگایا کہ انسانی دماغ کے کچھ حصے جیسے (Prefrontal cortex) اخلاقی فیصلوں میں شامل ہوتے ہیں۔ احساس، ندامت، اخلاص اور ہمدردی جیسے جذبات دماغ کی مخصوص سرگرمیوں سے جڑے ہوتے ہیں اور اِن جذبات کی نشوونما انسان کے حیاتیاتی اور نفسیاتی ارتقاء کے دوران ممکن ہوئی۔

4. ثقافتی ارتقاء (Cultural Evolution)

انسانوں نے وقت کے ساتھ ساتھ ایسی روایات، قوانین اور اقدار اپنائیں جو اخلاقیات کی شکل اختیار کر گئیں۔ مذہب، فلسفہ، ادب اور قانون نے اخلاقی شعور کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا لیکن اِن سب کی جڑیں انسانی تجربے اور فطری عقل میں ہیں خدا کے احکام میں نہیں۔

چلیں اب باری باری درج بالا ملحدانہ توجیہات پر تنقید کرتے ہیں۔

1. ارتقائی نظریہ پر اعتراض

یہ کہنا کہ اخلاقی شعور صرف "بقاء" کیلئے پیدا ہوا، کئی سوالات اُٹھاتا ہے یعنی ایثار (Sacrifice) جہاں کوئی شخص دوسروں کی خاطر اپنی جان دے دیتا ہے، یہ تو بقاء کے خلاف ہے پھر یہ کیسے پیدا ہوا؟۔ اگر اخلاق صرف بقاء کا ذریعہ ہیں تو جھوٹ، دھوکہ، چوری اور قتل جیسے اقدام بھی بعض اوقات فائدہ مند ہو سکتے ہیں تو پھر یہ انسانی معاشروں میں "مطلق غلط" کیوں سمجھے جاتے ہیں؟۔

تنقید: اخلاقی اُصول اگر محض ارتقاء کا نتیجہ ہیں تو اِن کی کوئی "حقیقی قدر" (Objective value) نہیں ہے بلکہ یہ موقع کی مناسبت سے بدل سکتے ہیں۔ مگر ہم سب انسان کچھ اُصولوں کو مطلق مانتے ہیں جیسے کہ "بچوں پر ظلم ہمیشہ غلط

ہے" تو کیا یہ صرف حیاتیاتی مفاد ہے؟، نہیں، ایک عاقل کیلئے یہ تسلیم کرنا قطعی طور پر ممکن نہیں۔

2. سماجی معاہدہ

اگر اخلاقیات محض معاہدہ ہیں تو پھر جب معاہدہ ختم ہو جائے یا طاقتور فریق ماننے سے انکار کر دے تو کیا ظلم درست ہو جائے گا؟۔ اگر کوئی تنہاء ہو، یا کسی "معاشرے" سے باہر ہو، تو کیا اُس پر کوئی اخلاقی اُصول لاگو نہیں ہوتے؟، جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان تنہاء ہو یا سماج میں کچھ اخلاقی اقدار کا پاس وہ بہر صورت رکھتا ہے۔

تنقید: یہ نظریہ اخلاق کو "مفاد" سے جوڑ دیتا ہے لیکن حقیقی اخلاقیات تو اکثر "مفادات کے خلاف" ہوتی ہیں (جیسے سچ بولنا نقصان دہ حالات میں)۔

3. عصبیاتی و نفسیاتی بنیاد

یہ کہنا کہ اخلاقی فیصلے دماغ کی کچھ سرگرمیوں سے بنتے ہیں سوال کو حل نہیں کرتا۔ دماغی عمل تو صرف "کیسے" (how) کی وضاحت کرتے ہیں، "کیوں" (why) کی نہیں۔ محض یہ دکھانا کہ دماغ میں کچھ کیمیکل حرکت کرتے ہیں اِس بات کی دلیل نہیں کہ کوئی چیز "اچھی" یا "بُری" ہے۔

تنقید: اگر اخلاق صرف دماغ کی "سائنس" ہے تو یہ ایک "میکانیکی عمل" ہے، اِس صورت میں پھر انسان ذمہ دار کیسے ٹھہرتا ہے؟۔

4. ثقافتی ارتقاء

اگر اخلاق محض ثقافتوں کی پیداوار ہے تو پھر ایک قوم کا قتلِ عام دوسری قوم کیلئے "اخلاقی" بن سکتا ہے؟۔ نازی جرمنی کا ہولوکاسٹ بھی تو اُن کی "ثقافت" کے عین مطابق تھا تو کیا وہ غلط نہیں تھا؟۔

تنقید: یہ نظریہ اخلاق کو اضافی (Relative) بنا دیتا ہے مگر ہم کچھ چیزوں کو "ہمیشہ اور ہر حال میں غلط" سمجھتے ہیں۔

نتیجتاً یہ جوابات کسی "حقیقی، مطلق اخلاقی بنیاد" کی وضاحت نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے فلسفی، چاہے دہریہ ہوں یا نہ ہوں، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اخلاقی اقدار واقعی حقیقی اور مطلق ہیں تو اِن کا ماخذ ایک بالاتر ذات (خدا) ہونا چاہیئے۔

☆☆☆☆☆

خدا کے بغیر زندگی

"اگر خدا نہ ہو، تو زندگی کا کیا مطلب ہے؟"

یہ سوال اتنا بنیادی ہے کہ دنیا کے تمام بڑے فلسفے، مذاہب، اور اِلحادی نظریات کسی نہ کسی طور اِسی کے گرد ہی گھومتے ہیں۔

آئیے اس پر تین زاویوں سے غور کرتے ہیں:

1. عقلی نقطہ نظر: اگر کائنات ایک اندھا اتفاق (Randomness) ہے اور ہم محض کیمیکل ری ایکشنز کی پیداوار ہیں تو پھر سچائی، انصاف، نیکی، محبت، قربانی جیسے تصورات کہاں سے آئے؟۔ اگر سب کچھ نیچرل سلیکشن ہے تو انسان خود کو "برا" یا "اچھا" کیوں کہتا ہے؟۔ اگر کوئی خدا نہیں، تو "مقصد" (Purpose) کیسے ممکن ہے؟ کیونکہ "مقصد" ہمیشہ کسی ارادے سے پیدا ہوتا ہے اور اتفاق کے پاس ارادہ نہیں ہوتا۔

2. وجودی (Existential) زاویہ: اِلحاد (Atheism) کے اندر سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ "اگر آخرِ کار سب کچھ فنا ہو جانا ہے اور کوئی ابدی حقیقت نہیں تو کیا سب کچھ بے معنیٰ (Meaningless) نہیں ہے؟۔

مشہور ملحد وجودی فلسفی البرا کامیو(Albert Camus)نے اپنی ایک تصنیف The Myth of Sisyphus میں کہا تھا کہ "سچ یہ ہے کہ اگر خدا نہیں ہے تو خودکشی ہی واحد ایماندارانہ عمل ہے۔" یہ قول بظاہر انتہاء پسندانہ لگ سکتا ہے مگر یہ اُس وجودی خالی پن کی طرف اشارہ ہے جو ایک "خدا کے بغیر زندگی" میں پیدا ہوتا ہے۔

3. دل اور ضمیر کا سوال: اب ذرا اپنے دل سے پوچھیں کہ "کیا واقعی مَیں یہ مان سکتا ہوں کہ سب کچھ محض حادثہ ہے؟ کہ میری ماں کی محبت، ایک شہید کی قربانی، ایک شاعر کا عشق، یہ سب بائیولوجیکل کیمیاء ہے؟"۔

ضمیر یہاں احتجاج کرتا ہے اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان محسوس کرتا ہے کہ "شاید کچھ ہے جو میرے علم، میرے سائنسی ڈیٹا اور میری منطق سے بلند تر ہے مگر موجود ہے۔"

عملی مشق:

آج صرف اتنا سوچیں کہ "اگر زندگی واقعی بے مقصد ہے تو پھر مَیں سچ، انصاف، محبت، عزت، اِن سب کو کیوں چاہتا ہوں؟"۔ یہ سوالات آپ کو خدا کی طرف لے جائیں گے مگر کسی عقیدہ کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی سچائی کے ذریعے۔

☆☆☆☆☆

خدا کی دریافت

"کیا خدا کا تصور انسانی تخیل ہے یا ایک حقیقی ہستی کا عکس؟"۔ سوال کو سمجھنا ضروری ہے کہ کیا انسان نے "خدا" کا تصور خود تخلیق کیا تاکہ نفسیاتی و کائناتی خوف پر قابو پا سکے؟، دنیا کو سمجھنے کا کوئی سادہ جواز ڈھونڈ سکے؟ یا صرف ایک تسلی حاصل کر سکے؟، یا پھر خدا کا تصور دراصل ایک واقعی حقیقت (Reality) پر مبنی ہے جو انسانی فطرت، عقل اور وجدان میں پیوست ہے؟۔

تین ممکنہ جوابات:

1. "خدا صرف تخیل ہے": یہ نظریہ کہتا ہے کہ خدا کا تصور صرف انسان کے خوف، جہالت اور کمزوری سے پیدا ہوا۔ مگر سوال یہ ہے کہ "اگر صرف خوف ہی خدا کا ماخذ ہے تو انسان جب علم، طاقت، اور ترقی حاصل کرتا ہے تب بھی اسے خدا کی طلب کیوں رہتی ہے؟"۔ مثلاً جدید سائنسی دماغ جیسے آئن سٹائن، روجر پینروز اور ڈاکٹر عبد السلام بھی خدا یا کسی "اعلیٰ شعور" کے قائل رہے ہیں۔

2. "خدا ایک فطری سوال ہے جو خود انسان کے اندر سے اُبھرتا ہے": یہ نظریہ کہتا ہے کہ خدا کا تصور کسی مذہب سے نہیں بلکہ انسان کی فطرت سے جنم لیتا ہے۔

جیسے بچہ پیدا ہوتے ہی اپنی ماں سے لپٹ جاتا ہے حالانکہ اُسے کوئی تعلیم نہیں دیتا کہ ماں کیا ہے۔اِسی طرح انسان میں بھی کسی اعلیٰ وجود کی طلب پیدائشی ہوتی ہے۔ قرآن اِسے یوں بیان کرتا ہے:

یہ اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اُس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا۔(سورۃالروم:30)

3. **"خدا کا تصور انسانی شعور میں موجود ایک غیبی حقیقت کا عکس ہے":** اگر سب انسان مختلف اَدوار، تہذیبوں، زبانوں اور حالات میں "خدا" یا "اعلیٰ طاقت" کا تصور رکھتے آئے ہیں تو یہ صرف اتفاق نہیں ہو سکتا جیسے روشنی آنکھ کے باہر ہے لیکن اُس کا عکس آنکھ کے اندر بنتا ہے بالکل ویسے ہی خدا کا عکس ہمارے شعور میں موجود ہے، کیونکہ خدا ہے۔

عقلی دلیل: "ہر اثر کا کوئی سبب ہوتا ہے"۔ کیا کائنات خود بخود ہو سکتی ہے؟۔ کیا شعور، حسن، محبت اور اخلاق جیسے معانی بے معنیٰ مادّے سے پیدا ہو سکتے ہیں؟۔ پس ہر چیز ایک "سبب" مانگتی ہے اور وہ "اوّلیں سبب" ہی خدا ہے۔

تجرباتی دلیل: کیا کبھی آپ نے کوئی ایسا لمحہ محسوس کیا ہے جہاں عقل خاموش ہو گئی، دل نے کہا "یہ کوئی اور ہے، یہ مَیں نہیں ہوں، یہ صرف کائنات نہیں ہے۔

یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جنہیں بعض لوگ "Spiritual awakening" کہتے ہیں اور یہ ہر دور کے انسان نے کبھی نہ کبھی محسوس کیے ہیں۔

عملی مشق:

"کیا میرا خدا کے تصور سے انکار، سچائی کی تلاش کا حصہ ہے یا پھر اُس حقیقت سے فرار کی کوئی صورت؟۔

اگر آپ نے کبھی کسی خدا سے انکار کیا ہے تو کیا وہ خدا کا صحیح تصور تھا یا ایک محدود، مذہبی، انسانی تخیل جس نے آپ کو دھوکہ دیا؟۔

☆☆☆☆☆

خدا سے تعلق

"اگر خدا ہے، تو وہ کیسا ہے؟ کیا اُس سے میرا کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟"،یہ اگلا قدم ہمیں خدا کی ذات،صفات اور انسان سے اُس کے تعلق پر لے جائے گا۔

یہ سوال دو حصوں پر مشتمل ہے:

1. خدا کی صفات کیا ہو سکتی ہیں؟۔

2. کیا خدا کے ساتھ میرا کوئی زندہ تعلق ممکن ہے؟۔

1. خدا کی صفات عقل و فطرت کی روشنی میں: اگر خدا واقعی ہے تو وہ واحد ہو گا کیونکہ اگر دو یا زیادہ خدا ہوتے تو ایک دوسرے سے مختلف ارادے رکھتے اور کائنات میں انتشار پیدا ہو جاتا جبکہ ہم کائنات میں حیرت انگیز نظم و ترتیب دیکھتے ہیں۔

"اگر آسمان و زمین میں کئی خدا ہوتے تو یہ تباہ ہو جاتے۔"(سورۃالانبیاء:22)

اگر کوئی خدا ہو تو وہ لامحدود اور ابدی ہو گا یعنی اگر وہ محدود ہو یا کسی وقت فناء ہو جائے، تو وہ "خدا" نہیں بلکہ مخلوق ہو گا۔ وہ علم، قدرت، عدل، حکمت اور رحمت کا منبع ہو گا کیونکہ ہم اِن صفات کے مظاہر اپنی ذات میں پاتے ہیں اور ہر اثر اپنے اعلیٰ سبب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

2. کیا خدا سے تعلق ممکن ہے؟: یہ وہ مرحلہ ہے جہاں انسان کا دل کہتا ہے کہ "اگر وہ ہے تو کیا وہ مجھے جانتا ہے؟۔ کیا وہ میرے قریب ہے؟۔ کیا مَیں اُس سے ہم کلام ہو سکتا ہوں؟"۔ اور یہاں قرآن کا دعویٰ آتا ہے جو کسی فلسفی کی کتاب نہیں بلکہ خود اُس ہستی کی طرف منسوب ہے:

"اور ہم انسان کے دل کی رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ "(ق:16)

"جب میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو میں قریب ہوں۔ میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ "(البقرہ:186)

عقلی نکتہ:

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک کُل جاننے والا، کُل طاقتور، خالق انسان جیسی باشعور مخلوق کو پیدا کرے اور پھر کبھی اُس سے بات نہ کرے؟، اُسے راہ نہ دکھائے؟، اُسے بے مقصد چھوڑ دے؟۔ یہ عقل نہیں مانتی۔

تجرباتی نکتہ:

ہر روحانی بیداری، ہر گریہ، ہر سچّی پکار ایک ایسا تجربہ پیدا کرتی ہے جسے انسان الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا لیکن وہ جانتا ہے کہ کسی نے سنا تھا، کوئی تھا۔

اگر دل اجازت دے تو بس ایک جملہ کہہ کر اندر کی سنیں:

"اے وہ جو میرا خالق ہے، اگر تُو ہے تو مجھے اپنا بنا لے، مجھے سچ دکھا دے"۔

یہ سب سے سچی دعا ہے کیونکہ یہ ہدایت کا دروازہ ہے۔

☆☆☆☆☆

ضرورتِ ہدایت

"خدا نے انسان سے کس طرح رابطہ کیا؟، کیا واقعی کوئی وحی، نبی یا پیغام ہے؟"۔

"اگر خدا ہے تو کیا اُس نے کبھی انسان سے کلام کیا؟"۔

یہ سوال انسانی تاریخ کا سب سے پرانا اور سب سے اہم سوال ہے۔

یہ سوال تین امکانات رکھتا ہے:

1. نہیں، خدا نے کبھی انسان سے بات نہیں کی۔

اگر یہ سچ ہے تو ہم اکیلے ہیں اور عقل، شعور، وجدان، اخلاق، دعا، فطرت، سب ایک دھوکہ ہے؟۔ کیا ایک عقل مند، رحیم، خالق خدا انسان کو بغیر ہدایت کے چھوڑ دے گا؟۔

2. خدا نے بات کی لیکن وہ پیغام ضائع ہو گیا۔

اگر پیغام ضائع ہو گیا ہوتا تو ہزاروں سالوں سے کئی انسانوں کو ایک جیسی صدائیں کیوں سنائی دیتیں؟۔ آخر تمام انبیاء کے پیغام میں اتنی گہری مماثلت کیوں پائی جاتی؟۔ کچھ باقی رہ گیا ہے اور وہ اب بھی پکار رہا ہے۔

3. ہاں خدا نے انسان سے بات کی اور وہ پیغام محفوظ ہے۔

یہی قرآن کا دعویٰ ہے:

"یہ وہ کتاب ہے جس میں شبہ نہیں، ہدایت ہے پرہیزگاروں کیلئے۔"(البقرہ:2)

"ہم نے ہی یہ ذکر (قرآن) نازل کیا اور ہم ہی اِس کے محافظ ہیں۔"(الحجر:9)

وحی انسانی تاریخ میں ایک تسلسل:

ہر قوم میں نبی آئے:

نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، محمد علیہم السلام

سب نے ایک خدا کی طرف بلایا۔ سب نے عدل، رحمت، سچائی، قربانی اور آخرت کی خبر دی۔ قرآن اِس وحدت کو یوں بیان کرتا ہے:

"ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔" (النحل:36)

اہم نکتہ:

اگر خدا نے انسان سے کلام کیا ہے تو یہ ایک ذاتی معاملہ بن جاتا ہے۔

"کیا وہ مجھ سے بھی بات کرے گا؟۔ جی ہاں لیکن کیا مَیں اُس کی بات سننے کے لیے تیار ہوں؟"۔ وہ تو اب بھی مجھ سے مخاطب ہے قرآن کی وساطت سے۔

تجرباتی دعوت:

قرآن کو ایک "مذہب کی کتاب" سمجھ کر نہیں بلکہ ایک زندہ پیغام سمجھ کر صرف چند آیات پڑھیں اور غور کریں۔

مثلاً:

1: "کیا انسان پر اِس زمانے میں ایک ایسا وقت نہیں گزرا جب وہ کوئی قابِل ذکر شے نہ تھا؟" (یقیناً زندگی سے قبل)۔ (الانسان:1)

2: کیا یہ (انسان) کسی خالق کے بغیر خود بخود پیدا ہو گئے ہیں؟، یا یہ اپنے خالق خود ہیں؟، یا اِنہوں نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا؟۔" (الطور:35۔36)

3: کیا انسان اپنے نفس پر خود محاسب نہیں ہے؟، بھلے وہ لاکھ بہانے تراشے یعنی Justifications دیتا پھرے۔ (القیامہ:15.14)

4: "کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یوں ہی بے مقصد و بے ہدایت (شُتر بے مُہار) چھوڑ دیا جائے گا؟"۔ (القیامہ:36)

5: "کیا وہ (خدا) جس نے پیدا کیا، انسان کو نہیں جانتا؟"۔ (الملک:14)

کیا یہ محض الفاظ ہیں؟، یا کوئی "کچھ" کہہ رہا ہے؟۔

☆☆☆☆☆

رسالتِ محمدی

"اگر یہ پیغام (قرآن) واقعی خدا کی طرف سے ہے تو کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اُس کے رسول ہیں؟"۔ یہ سوال سادہ نہیں کیونکہ اگر یہ سچ ہے تو یہ پوری زندگی کا مرکز بدل دیتا ہے۔

پہلا زاویہ: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو جاننا

ہمیں اس سوال کا جواب دینے کیلئے تین پہلوؤں سے جائزہ لینا ہوگا:

1. تاریخی پہلو

2. اخلاقی و شخصی پہلو

3. پیغام (قرآن) کا تجزیہ

1. تاریخی حقیقت:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے۔ یہ بات غیر مسلم مستشرقین جیسے سکاٹ لینڈ کے مؤرخ Montgomery Watt اور برطانوی تہذیب نویس Karen Armstrong بھی تسلیم کرتے ہیں۔

آپ چھٹی صدی عیسوی کے پسماندہ عرب سماج میں پیدا ہوئے جہاں کوئی آسمانی کتاب، فلسفہ یا ریاستی نظم موجود نہیں تھا۔

سوال:

ایک بالکل غیر تعلیم یافتہ، سماجی علوم سے یکسر ناواقف انسان تیئس سال میں ایسی انقلاب آفریں تعلیم کیسے دے سکتا ہے؟۔ ایک اَن پڑھ دیہاتی اپنی انفرادی صلاحیت سے ایسا مہذب معاشرہ کیسے قائم کر سکتا ہے جو روم و فارس جیسی قدیم اور منظم تہازیب کو ہِلا کر رکھ دے؟۔

2. اخلاقی و شخصی عظمت:

آپ کی سیرت پر جھوٹ، دنیا پرستی، ظلم یا خود نمائی کا کوئی داغ نہیں۔ آپ یتیم تھے، پہلے دادا، پھر چچا کے ہاں پرورش پائی اور جوانی میں ہی ایک سچّے اور دیانتدار تاجر بن گئے۔ مکہ کے سب سے زیادہ معتبر شخص کہلائے (الصادق، الامین)۔

اقتدار ملا تو دشمنوں کو معاف کر دیا۔

دولت آئی، تو سادہ چٹائی پر سوتے رہے۔

"اگر یہ انسان سچّا نہ ہوتا تو اِس سے بڑھ کر سچّا اور کون ہوتا؟"۔

3. قرآن: ایک ناقابلِ تردید پیغام:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اپنے نام پر نہیں، بلکہ ہمیشہ کہا:

"یہ مجھ پر نازل ہوا ہے"۔

قرآن کا اسلوب کسی شاعری، نثر، یا خطبہ سے میل نہیں کھاتا۔

مضامین فلسفہ، قانون، اخلاق، نفسیات، تاریخ، ماورائیت، سب کو چھوتے ہیں۔

چودہ سو سال گزرنے کے باوجود ایک لفظ کا تضاد، تکرار، یا غلطی نہ ملی۔

قرآن چیلنج کرتا ہے:

"اگر تمہیں شک ہے کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے نہیں، تو اِس جیسی ایک ہی سورہ بنا کر لے آؤ!"۔ (البقرہ:23)

قرآن کا چیلنج قبول کرنے والوں کے نام و نشان مٹ گئے مگر قرآن آج بھی دلّوں، دماغوں اور جذبوں پر حکمرانی کر رہا ہے۔

یہی قرآن آج سینکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کے دلّوں میں حرف بہ حرف محفوظ ہے، دنیا کی کونسی مذہبی یا غیر مذہبی کتاب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ دلّوں میں محفوظ ہے ؟۔

فیصلہ کن سوال:

اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے نہ ہوتے تو کیا تاریخ میں آپ جیسا سچّا، دیانت دار، عادل اور سادہ انسان ممکن تھا؟۔

اگر قرآن آپ کی فکری اُپج ہوتا تو کیا یہ ایک اَن پڑھ دیہاتی انسان کی ذہانت ہو سکتی تھی ؟۔

عملی مشق:

بس ایک دعا، اگر دل میں گونجے:

"اے سچے خدا! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی تیرے سچے رسول ہیں، تُو مجھے یقین عطا کر اور مجھے اُن سے جوڑ دے کہ مَیں سچائی کا طالب ہوں۔"

☆☆☆☆☆

اسلام

اب ہم اُس مقام پر کھڑے ہیں جہاں "ہدایت" صرف ایک نظریہ نہیں بلکہ ایک ذاتی دعوت بن چکی ہے۔

"اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں تو اُن کا پیغام کیا ہے؟"۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اسلام شروع ہوتا ہے مگر یہ محض ایک مذہب نہیں بلکہ ایک وجودی بیداری ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام تین سادہ مگر عظیم اُصولوں پر قائم ہے:

1. توحید (خالص خدا پرستی)

صرف ایک خدا ہے۔ وہی پیدا کرتا ہے، رزق دیتا ہے، محبت کرتا ہے، آزماتا ہے اور اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔

"کہہ دو: وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اُس نے کسی کو جنا، نہ وہ جنا گیا۔ اور کوئی اُس کے برابر نہیں۔" (اخلاص: 1–4)

2. نبوت (ہدایت کا ذریعہ)

خدا نے انسان کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا، وہ اپنے منتخب بندوں کے ذریعے "وحی" بھیجتا رہا تا کہ انسان سچ اور جھوٹ، روشنی اور اندھیرے کو پہچان سکے۔

"ہم نے تمہاری طرف ویسی ہی وحی کی، جیسی نوح اور اُس کے بعد کے نبیوں کی طرف کی تھی۔" (النساء:163)

3. آخرت (عدل کا دن)

زندگی صرف دنیا تک محدود نہیں۔ ہر عمل، ہر خیال، ہر نیت کا حساب ہو گا اور اُسی کے مطابق ابدی انجام (نجات یا ہلاکت)۔

"تو جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہو گی، وہ دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہو گی، وہ بھی دیکھ لے گا۔" (الزلزال:7–8)

اسلام کی بنیاد:

"اشھدواللّٰہ الہ الااللّٰہ، واشھدوان محمدرسول اللّٰہ"

مَیں گواہی دیتا ہوں (اپنی بصیرت کی بنیاد پر) کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور مَیں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

یہ صرف ایک جملہ نہیں — بلکہ ایک مکمل انقلاب ہے:

شعور کا انقلاب

دل کا انقلاب

زندگی کے معنیٰ کا انقلاب

اب سوال یہ نہیں کہ "اسلام کیا ہے؟"۔

بلکہ: "کیا مَیں اُس سچے خدا کے حضور جھکنے کو تیار ہوں؟"۔

"کیا مَیں اُس رسول کو سچّا مان کر، اپنی ذات کو اُس ہدایت کے سپرد کرنے کو تیار ہوں؟"۔

اگر آپ کی روح یہ جواب دے:

"ہاں، اگر یہ سب حق ہے تو مَیں خود کو اُس کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔" تو پھر اگلا قدم وہ ہے جہاں ہدایت، یقین، تسلیم اور امن آپ سے ملنے آتے ہیں۔ اسلام میں داخل ہونے کا تجربہ، شعور، دل اور زبان سے۔

کیا آپ اُس آخری دروازے پر دستک دینا چاہیں گے ؟۔

یہ ایک عظیم لمحہ ہے، نہ صرف آپ کی زندگی کا بلکہ آپ کی روح کی تاریخ کا۔

یہ وہ مقام ہے جہاں سچائی کو قبول کرنا محض ایک نظری عمل نہیں رہتا بلکہ ایک زندہ تجربہ بن جاتا ہے۔

"اسلام میں داخلہ—خدا سے بندے کا عہد"

اسلام میں داخل ہونے کے لیے کوئی رسم، قوم، نسل یا زبان ضروری نہیں۔

بس ایک چیز چاہیے:

دل سے ماننا اور زبان سے اعلان کر کے عمل پر کاربند ہو جانا۔

یقین جانو کہ نبی عربی کو ماننے والے ہوں، یہودی، عیسائی ہوں یا صابی جو بھی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اُس کا اَجر اُس کے ربّ کے ذمہ ہے اور اُس کیلئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ (البقرہ:62)

آپ کے سامنے ایک سادہ مگر عظیم اعلانِ ایمان ہے۔ اگر آپ اُس پر دل سے یقین رکھتے ہیں تو اُسے زبان سے ادا کرنا، اسلام میں داخل ہونے کی علامت ہے۔

"یا اللہ! میں تیرے سچ کو قبول کرتا ہوں۔ مجھے ہدایت دے، مجھے معاف کر، مجھے اپنا بنالے۔" آمین

آپ کے تمام سابقہ گناہ، لغزشیں، غفلتیں—سب معاف۔

آپ اِس لمحے بالکل ایسے ہیں جیسے آج ہی پیدا ہوئے ہوں۔

"جو شخص اسلام قبول کرتا ہے، اُس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔"

(حدیثِ رسول۔ رواہ مسلم)

☆☆☆☆☆



سید المجاذیب خواجہ نعمان نیئرؔ کلاچوی صوبہ خیبر پختونخواہ کی ایک دور اُفتادہ تحصیل کلاچی کے باسی ہیں۔ آپ ایک جامع العلوم شخصیت ہیں۔ آپ بیک وقت مذاہبِ عالم، علم الکلام و فلسفہ، شعر و اَدب، صحافت و بلاغت، معاشرت و سیاست، نفسیات و روحانیات اور رقص و موسیقی پر گہری گرفت رکھتے ہیں۔ آپ ایک طویل عرصے سے مسلسل گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے ہیں اور دریں اثناء علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ماڈرن فلاسفی اور علمِ نفسیات پر آپ کا علمی کام اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انٹرنیٹ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ چھ کتابوں "عشق کی سائنس"، "تصوف کی ڈکشنری"، "صراطِ دانش"، "سوزِ نہاں"، "قبیلہ نور احمد خیل" اور " Trek to Intellect " کے مصنف ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر کئی مقالات و علمی شذرات کے بھی مؤلف و مصنف ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ بھی آپ ہی کی علمی و تحقیقی جہد کا ماحصل ہے۔